

# خواب سے باہر

فہیم شناس کاظمی

# خواب سے باہر

فہیم شناس کاظمی

## جملہ حقوقِ بحقِ شاعر محفوظ ہیں

فہیم شناس کاظمی  
 معرفت عمران پینٹرز، نیولیاقت مارکیٹ - نواب شاہ  
 Cell: 0302-2887757  
 0333-3359155  
 e-mail: faheemshanas@g-mail.com  
 faheemshanas@yahoo.com  
 faheemshanas@hotmail.com

کتاب کا نام	خواب سے باہر
شاعر	فہیم شناس کاظمی
مشاورت	اکبر معصوم، کاشف حسین غازر
سرورق	حبیب الرحمن اعوان
اشاعت	جنوری ۲۰۰۹ء
قیمت	/- ۱۵۰ اروپے

ناشر  
 فکشن ہاؤس  
 ۱۸، مرنگ روڈ، لاہور

والدِ محترم سیدنا ظہم حسین شاہ کے نام

## آئینہ

ڈھنڈائے منظروں میں ستارا ہے تیرانام  
بارانِ سنگ زینب لاچار کے لیے

## غزلیں

- ❖ خامشی اتنی رہی ہے مجھ میں
- ❖ تمہارے بعد جو بکھرے تو گوبہ گو ہوئے ہم
- ❖ ہم ایک دن نکل آئے تھے خواب سے باہر
- ❖ بے شکل منظروں میں
- ❖ روز کا غذ پہ دل بناتا ہوں
- ❖ برگِ صدا کو لب سے اڑے دیر ہو گئی
- ❖ تیری نظر و کے اشارے سے بدلتا ہے سماں
- ❖ سبز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں
- ❖ تری جستجو میں ترے شہر میں
- ❖ ہے وقتِ سحر اور دیے جلتے ہیں ابھی تک
- ❖ راہ گذرانچانی ہے
- ❖ بھٹک رہی ہے یوں ہی راستے میں تیز ہوا
- ❖ تیری آنکھوں کا اجالاترے چہرے کا دیا
- ❖ بدن کو خاک کیا اور لہو کو آب کیا
- ❖ اس رہ گزارِ خواب سے وہ گل بدن گئے
- ❖ اور ہی دنیا ہم نے ایک بسالی ہے
- ❖ ڈکھ میں ڈوبا ہوا جہاں ہوں میں

◊ شام کے سائے چلے آئے درود یوار تک  
 ◊ پھر ستارے نہ وہ گلاب ملے  
 ◊ دیکھیں گے اُسے پردہ افلانک سے آگے  
 ◊ رہنا ہے دیر تک مجھے دنیا کے سنگ بھی  
 ◊ رقصِ سیار گاں نہیں رُکتا  
 ◊ میں یوں جہاں کے خواب سے تنہا گزر گیا  
 ◊ ڈھونڈنے اُس کو کہاں جاتا ہے  
 ◊ زمین پر نہ رہے آسمان کو چھوڑ دیا  
 ◊ اے دوست پہلے اپنی گواہی پے غور کر  
 ◊ جانے کیسی ہے کشش بہتے ہوئے پانی میں  
 ◊ خواب کے شہر میں اک شخص ستارے جیسا  
 ◊ مرے نہ ہونے کا قصہ سنائیا مجھ کو  
 ◊ دولتِ درہم و دینار نہیں چاہتے ہم  
 ◊ دنیا کسی خیال میں تبدیل ہو گئی  
 ◊ سمجھ رہا تھا میں یہ دن گزرنے والا نہیں  
 ◊ لمبی لمبی وقت ہمیں تقسیم کرے  
 ◊ آنکھوں میں زندگی کا نظارا تھا آخری  
 ◊ برآمدے میں کھڑا رہوں گا  
 ◊ دل و نگاہ میں اس کو اگر نہیں رہنا  
 ◊ بانہوں کے حلقوں میں وہ پری زاد ہو وے گی  
 ◊ چراغ شامِ غریب ان نظر میں رہتا ہے  
 ◊ شناس خوار ہوئے اور بس ہوئے یونہی  
 ◊ کم کسی طور یہ وحشت نہیں ہونے والی  
 ◊ رقصِ سیار گاں کو دیکھتا ہوں  
 ◊ اپنے ہونے پے بھی شرمندہ رہے

◊ دل میں تیرا خیال ہے تا حال  
 ◊ اب تو یوں ہے کہ زمانے سے بچا نکیں خود کو  
 ◊ ہے زمیں میری، سمندر میرا  
 ◊ کہیں ہو جائے اب یہ راستہ تبدیل ممکن ہے  
 ◊ حصارِ ذات سے آگے نکل رہا ہے کوئی  
 ◊ میان بحر و برجیت ہے میری  
 ◊ غم کی تصویر بنانے میں بہت دیر لگی  
 ◊ ازل سے آج تک خود سے ہی نہاں ہوں میں  
 ◊ دُھند میں ڈوبی ساری فضا تھی، اس کے بال بھی گیلے تھے  
 ◊ نگارخانہ ابرو ہوا پسند آیا  
 ◊ ہاتھوں میں پھول، آنکھوں میں سپنا لیے ہوئے  
 ◊ اک کہانی ہے سناؤں تو سنابھی نہ سکوں  
 ◊ حسن الفاظ کے پیکر میں اگر آ سکتا  
 ◊ نواحِ سامرہ اور نینوای کے پیچ کہیں  
 ◊ کر بلا بھی فرأت ہم نے کی  
 ◊ قصہ دل ہے نا تمام ابھی  
 ◊ اک منظرِ خوش رنگ دکھا جاتا ہے پانی  
 ◊ منتظر اس کے شام و عدہ رہے  
 ◊ درد کی لہر اٹھائے لیے جاتی ہے مجھے  
 ◊ اول اول تھے ہم محبت کے  
 ◊ لہو میں آگ نظر میں دبکتی بے خوابی  
 ◊ ہر ایک سمت ہے ٹو اور نگارخانہ وہی  
 ◊ جانے کس لہر میں تھا کو زہ گر  
 ◊ رستے میں شام ہو گئی قصہ تمام ہو چکا  
 ◊ روشنی تھی کھلے در پھوں میں

❖ لہو کی لہر میں اک خواب دل شکن بھی گیا  
 ❖ دل تباہ کو اب تک نہیں یقین آیا  
 ❖ ایسے دنیا میں کسی کا بھی گذارا ہوا ہے  
 ❖ اس نے پوچھا بھی مگر حال چھپائے گئے ہم  
 ❖ آپ اس وقت ہیں جہاں بابا

ڈھنڈلائے منظروں میں ستارا ہے تیرا نام  
تنہائیوں میں دل کا سہارا ہے تیرا نام

چاروں طرف عجیب سی اک روشنی ہوئی  
جب لوحِ دل پہ میں نے آتا را ہے تیرا نام

ہر ایک حرف کھلتا ہوا اک گلاب سا  
ہر ایک نام سے مجھے پیارا ہے تیرا نام

ماہیوں کے گھور اندریوں میں روشنی  
غم کے سمندروں میں کنارا ہے تیرا نام

ہر ایک لمحہ تیری طلب میں بسر ہوا  
ہر ایک لمحہ میں نے پکارا ہے تیرا نام

تنظیم میری بکھری ہوئی ذات کی ہوئی  
جب روح و دل سے میں نے گزارا ہے تیرا نام

نا آشنا ہے آج تک اس راز سے شناس  
وہ رمز کیا ہے جس کا اشارا ہے تیرا نام

اسرارِ کائنات ہی اب تک نہیں گھلے  
مولائے کائنات کو شمچھے گا کوئی کیا

بارانِ سنگ زینب  
کے  
زنجیر و طوق عابدِ بیمار کے لیے

اعزاز ہے یہ صرف شاۓ حسینؑ کا  
بوسے لحدنے بڑھ کے عزادار کے لیے

اس کو بھی علم تھا مرا حق دار کون ہے  
تھا منتظر علم بھی علمدار کے لیے

سر جائے، جائے بیعتِ ظالم نہ ہو شناس۔  
لازم ہوا ہے یہ مرے معیار کے لیے

تتلی کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں لمحے  
پھولوں کی طرح دیکھتے رہتے ہیں اُبھیں ہم



خامشی اتنی رہی ہے مجھ میں  
گفتگو ڈوب گئی ہے مجھ میں

ایک بس تم ہی نئے آئے ہو  
اور سب کچھ تو وہی ہے مجھ میں

دُور تک دنیا نظر آنے لگی  
ایسی دیوار گری ہے مجھ میں

میں مہکتا ہوں تری خوشبو سے  
خود کو تو بھول گئی ہے مجھ میں

کتنا شفاف تھا منظر میرا  
کس قدر دھول اڑی ہے مجھے میں

زندگی رقص کبھی کرتی تھی  
اب تو چپ چاپ پڑی ہے مجھے میں

میری تکمیل تو ہو جائے شناس  
ایک منظر کی کمی ہے مجھے میں



تمہارے بعد جو بکھرے تو گوبہ گو ہوئے ہم  
پھر اس کے بعد کہیں اپنے رو برو ہوئے ہم

تمام عمر ہوا کی طرح گزاری ہے  
اگر ہوئے بھی کہیں تو کبھو کبھو ہوئے ہم

یوں گرد راہ بنے عشق میں سمٹ نہ سکے  
پھر آسمان ہوئے اور چارسو ہوئے ہم

رہی ہمیشہ دریدہ قبائے جسم تمام  
کبھی نہ دستِ بُنْر مند سے رفو ہوئے ہم

خود اپنے ہونے کا ہر اک نشاں مٹا ڈالا  
شناں پھر کہیں موضوع گفتگو ہوئے ہم



ہم ایک دن نکل آئے تھے خواب سے باہر  
سو ہم نے رنج اٹھائے حباب سے باہر

اسی امید پہ گزری ہے زندگی ساری  
کبھی تو ہم سے ملو گے جباب سے باہر

تمہاری یاد نکلتی نہیں مرے دل سے  
نشہ چھلکتا نہیں ہے شراب سے باہر

کسی کے دل میں اُترنا ہے کا رِ لا حاصل  
کہ ساری دھوپ تو ہے آفتاب سے باہر

شاسکھول دیے جس نے ہم پہ سب اسرار  
وہ ایک لفظ ملا ہے کتاب سے باہر



بے شکل منظروں میں  
زندہ ہیں پتھروں میں

خاموشیاں عجب تھیں  
گرتے ہوئے گھروں میں

ہم تو سمیٹ لائے  
اک آسمان پروں میں

کیا چاند ڈھونڈتا ہے  
اب تک سمندروں میں

رہتے ہیں کیوں کبوتر  
ویران مقبروں میں

ہم سے بھی حال پوچھو  
ہم بھی تھے خود سروں میں



روز کاغذ پہ دل بناتا ہوں  
پھر اسے آگ میں جلاتا ہوں

اک سمندر مرے خیال میں ہے  
خواب میں کشیاں بناتا ہوں

کوئی کہتا ہے سرکشی نہ دیکھا  
جب قدم خاک سے اٹھاتا ہوں

مجھ کو رستے سے جس نے بھٹکایا  
میں اُسے راستہ دکھاتا ہوں

کوئی مجھ کو منانے آتا ہے  
جب بھی میں خود سے روٹھ جاتا ہوں



ابھی سے مجھ کو بتا دے اگر بچھڑنا ہے  
نئی نئی ہے محبت تجھے بھلا دوں گا



برگِ صدا کو لب سے اڑے دیر ہو گئی  
ہم کو بھی اب تو خاک ہوئے دیر ہو گئی

اب ساحلوں پہ کس کو صدا دے رہے ہوتم  
لمحوں کے بادبان گھلے دیر ہو گئی

اے حُسنِ خود پرست ذرا سوچ تو سہی  
مہر و وفا سے تجھ کو ملے دیر ہو گئی

تیرا وصال، خیر اب اک واقعہ ہوا  
اب اپنے آپ سے بھی ملے دیر ہو گئی

صدیوں کی ریت ڈھانپ کر آسودہ ہو گئے  
سر کو ہمارے تن سے کٹے دیر ہو گئی

صر صر ہو یا صبا ہو کہ ہوں تیز آندھیاں  
ہم کو فصلِ شب پہ جلے دیر ہو گئی

تیری گلی کے موڑ پہ پہنچے تھے جلد ہم  
پر، تیرے گھر کو آتے ہوئے دیر ہو گئی

اک دَور تھا شناسَ صدا تھی مری بلند  
اور اب تو میرے ہونٹ سلے دیر ہو گئی



تیری نظروں کے اشارے سے بدلتا ہے سماں  
تیرے قدموں کی روائی سے رواں آب رواں

روشنی چوئے اُسے رنگ اُسے پیار کریں  
اُس کے ہر عکس میں اک آئینہ خانہ ہے نہاں

اُن فضاؤں میں سکھایا گیا اڑنا ہم کو  
آندھیاں جال اٹھائے ہوئے پھرتی ہیں جہاں

دل میں رہ رہ کے کسی یاد کی ہوتی ہے کہ  
آنکھ کو کھینچ لیے جائے طسماتِ جہاں

زندگی مست رہے، چاہے سرِ دشت رہے  
ہو درد بستِ جہاں یا نہ رہیں کون و مکاں

کس لیے شام سے آبیٹھا ہوں گھر میں اپنے  
گرتے لوٹ کے آنے کا نہیں ہے امکاں

ہجر میں گرد ہوا غم بھی کوئی فرد ہوا  
ایک تھا میں ہی یہاں اور رہا میں بھی کہاں

پھر کوئی قیس کی مانند یہاں لہرائے  
موج میں آئے ہوا، رقص کرے ریگِ رواں



سیز جنگل میں پرندوں کے ٹھکانوں میں کہیں  
وقت چھوڑ آیا ہمیں گزرے زمانوں میں کہیں

گم بھی ہو سکتے ہیں تاریخ کے اور اق میں ہم  
مل بھی سکتے ہیں مگر تازہ فسانوں میں کہیں

رہ گئے خواب مرے شام کو بازاروں میں  
بک گئیں آنکھیں مری صح دوکانوں میں کہیں

شام سے پہلے کہیں اپنا ٹھکانہ کر لیں  
صح کونکلیں گے پھر اور جہانوں میں کہیں

خاک پر سوتے ہوئے یاد مجھے آتا ہے  
جائے ہوں گے مکیں اپنے مکانوں میں کہیں



گنگناتے راستوں کی دلکشی اپنی جگہ  
اور ان کے درمیاں تیری کمی اپنی جگہ



تری جتو میں ترے شہر میں  
رہے اتنے دن جانے کس لہر میں

یہاں ٹھیک سے کچھ بھی دیکھا نہیں  
کئی زندگی اپنی دوپہر میں

بس اپنی لگن ہی میں پھرتے رہے  
گزارے ہیں دن اس طرح دہر میں

کئی خواب آنکھوں پر اترے نہیں  
کئی رنگ آئے نہیں لہر میں

وہی بے دل ہے ترے مہر سے  
وہی دلکشی ہے ترے قہر میں



کیجیے اب ملال کم سے کم  
دل کا رکھیے خیال کم سے کم



ہے وقتِ سحر اور دیے جلتے ہیں ابھی تک  
آنکھوں میں ستارے سے چمکتے ہیں ابھی تک

خوشبو سا بدن پھر کوئی مجھ سے نہیں لپٹا  
جھونکے تو ہواں کے سکتے ہیں ابھی تک

اب بھی وہی پیشانی، وہی رنگ، وہی روپ  
حیرت سے اُسی شخص کو تکتے ہیں ابھی تک

کرتا ہوں بہت یاد مگر آتے نہیں یاد  
کچھ حرف مرے دل میں کھلتے ہیں ابھی تک

وہ کھڑکیاں مدت سے یوں ہی دیکھ رہا ہوں  
پردے سے سر کتے تھے، سر کتے ہیں ابھی تک

## ○

مسلسل ہے میرا سفر رات میں  
ہوں جیسے جہان طسمات میں  
یقین بھی نہیں ہے گماں بھی نہیں  
تو پھر کیا ہے، ارض و سماءات میں



راہ گزر انجانی ہے  
اور سفر لایعنی ہے

خواب، سراب کا سودا ہے  
چار طرف ویرانی ہے

رنگ ہے اور سمندر کا  
اور ہی آج روائی ہے

دشواری کے عالم میں  
جی لو تو آسانی ہے

کیسے اُس کو دیکھا میں

آج تک جیرانی ہے  
خط میں آدھی ہے تحریر  
آدھی بات زبانی ہے

پہلے تم بیگانے تھے  
اب دنیا بیگانی ہے

ہم کو ایک ہی رستے پر  
ساری عمر بتانی ہے

[نذرِ رساقِ غنائی]



بھٹک رہی ہے یونہی راستے میں تیز ہوا  
کوئی چراغ جلا اور نہ کوئی پھول کھلا

سب اپنی جان سے گزرے ہیں دل کو روتے ہوئے  
یہ عشق ہے کہ مصیبت یا کوئی اور بلا

جسے حیات سرکوئے ہجر لائی تھی  
تو واپسی کا اُسے کوئی راستہ نہ ملا

میں اُس کا ہو کے رہا سب گمان ہوتے ہوئے  
وہ میرے ساتھ رہا بھی تو فاصلے سے رہا



تیری آنکھوں کا اُجالا ترے چہرے کا دیا  
میں تجھے بھول گیا پھر بھی مجھے یاد رہا

حسن خود تیرا تعارف ہے زمانے کے لیے  
خس و خاشاک سے کچھ دُور نہیں ہے شعلہ

دل بھٹکتا رہا یادوں کے گھنے جنگل میں  
درد کے پھول کھلاتی رہی بے درد ہوا

آج تو بچھڑا تو دُکھ آنکھوں میں اہرانے لگے  
کاش تو مجھ کو سدا غیر ہی بن کر ملتا

انہی آنکھوں میں سُلگتا ہوا صحراء ہے جہاں  
اتنا پانی تھا کہ اک شہر یہاں ڈوب گیا

## ○

اک چاند آتے آتے افق تک پلت گیا  
پھر آسمانِ دامنِ شب سے لپٹ گیا  
کروٹ بدل کے سو گئی دل میں کسی کی یاد  
پل بھر میں ایک رنگ سا پھیلا سمٹ گیا



بدن کو خاک کیا اور لہو کو آب کیا  
پھر اس کے بعد مرتب نیا نصاب کیا

تھکن سمیٹ کے صدیوں کی جب گرے خود پر  
تجھے خود اپنے ہی اندر سے بازیاب کیا

پھر اس کے بعد ترے عشق کو لگایا گلے  
ہر ایک سانس کو اپنے لیے عذاب کیا

اگر وجود میں آ کر اُسے نہ ملنا تھا  
ہمیں کیوں بھیج کے اس دہر میں خراب کیا

اُسی نے چاند کے پہلو میں اک چراغ رکھا  
اُسی نے دشت کے ذرروں کو آفتاب کیا

## O

جہاں پہ قتل کی جاتی ہیں سوچیں  
پیغمبر ہے وہاں جو سوچتا ہے



اس رہ گزارِ خواب سے وہ گل بدن گئے  
ہم جن کی انجمن میں بصد جان وتن گئے

اب کے یہی ہوا ہے، یہی دھوپ ہے تو پھر  
ان تیلیوں کے ساتھ ہی سمجھو چمن گئے

جن کے لبوں کو دھوپ نے بو سہ نہیں دیا  
اُن کے لبوں پہ کیسے ہمارے سخن گئے

دیکھا جو اپنا حال تو آیا ہمیں یقین  
جو اپنے ہونہ پائے، تمہارے وہ بن گئے

خوشبو سے عمر بھر یہ ہوا پوچھتی رہی  
آخر کہاں چمن سے وہ اہل سخن گئے

## ○

ہم کس گماں میں آئے تھے عہدِ ثبات میں  
خود سے کہیں بھی مل نہ سکے کائنات میں  
یہ کون تشنہ کام اٹھا اس کنار سے  
ماتم کی ایک گونج ہے اب بھی فرأت میں



اور ہی دنیا ہم نے ایک بسالی ہے  
جس کے اندر ہر اک چیز مثالی ہے

عمر کا لمحہ لمحہ ہم نے بانٹ دیا  
تیری خاطر بس اک شام بچالی ہے

چاہے جس رستے سے آئے شہزادی  
ہم نے شہرِ دل سے ڈھوپ اٹھائی ہے

غم کی بارش کیسے ٹوٹ کے برسی ہے  
دل کے دشت میں ہر جانب ہر یालی ہے



دُکھ میں ڈوبا ہوا جہاں ہوں میں  
کیا کوئی شہر رفتگاں ہوں میں

تیری خواہش پہ خود میں سماٹا تھا  
دیکھ لے اب کہاں کہاں ہوں میں

اڑتا پھرتا ہوں اب غبار سا میں  
خود کو سمجھا تھا آسمان ہوں میں

اب وہ آیا سپردگی میں مری  
جبکہ خود سے بھی سرگراں ہوں میں

جنگ کس کے لیے ہے خود سے مری  
اور کس کا مزاج داں ہوں میں



شام کے سائے چلے آئے در و دیوار تک  
کس قدر دھندا گیا ہے کوچہ دلدار تک

گرم رکھتا ہے لہو کو خواہشوں کا سلسلہ  
دھوپ کے صحراء سے لے کر سایہ اشجار تک

جُز ترے کوئی طلب، خواہش کوئی مجھ کو نہیں  
وقتِ نامعلوم سے اس لمحہ دشوار تک

جیتے جی میدان سے میں پیچھے ہٹ سکتا نہیں  
جنگ کرنی ہے عدو کی آخری یلغار تک

کچھ دنوں پہلے یہاں اک شہر سا آباد تھا  
اب نظر آتے نہیں اُس شہر کے آثار تک

آندھیاں مجبور یوں کی چل رہی ہیں یوں شناس~  
میں لرزتے دیکھتا ہوں شعلہ انکار تک

## O

عشق و حشت کو عجب رنگ لگا دیتا ہے  
قیس کے قدموں سے لپٹی ہے بہارِ صحراء



پھر ستارے نہ وہ گلاب ملے  
تم ملے تھے کہ ہم سے خواب ملے

ایک دنیا ہمیں خراب ملی  
ایک دنیا کو ہم خراب ملے

چاند کرتا ہے خواہشیں کیسی  
چاہتا ہے کہ آفتاب ملے

ایک انڈھی گلی میں دے کے صدا  
منتظر کب سے ہوں جواب ملے



دیکھیں گے اُسے پردةِ افلاک سے آگے  
اک نقشِ قدم سرحدِ اوراک سے آگے

افسوں کہ مہلت نہ ملی دیکھتے اُس کو  
اک باغِ تھا خاک و خس و خاشاک سے آگے

خوابوں کی طلب لے کے نکل آئے ہیں گھر سے  
پر جائیں کہاں کوچہ غمناک سے آگے

ہم دیکھتے ہیں بنتے بکھرتے ہوئے منظر  
سب علم ہے جانا ہے کہاں خاک سے آگے

کب سے ہے مرے ہاتھوں کے اک لمس کا پیاسا  
خوبیو بھرا موسم تری پوشک سے آگے

اے جانِ شناس آؤ کبھی دیکھ کے آئیں  
کیا رنگ کھلے لمحہ بے باک سے آگے



ہم بھی کیا عجیب موسم تھے  
اپنے ہی آپ پر گزرتے رہے



رہنا ہے دیر تک مجھے دنیا کے سنگ بھی  
آیا ہوا ہوں میں اسی دنیا سے تنگ بھی

طفلانِ شہر میرے جنوں سے ہیں بے خبر  
یا پھر جنوں نہیں ہے سزاوارِ سنگ بھی

بس اے گل خیال مرے خواب میں نہ آ!  
مٹتے ہیں نقشِ دھوپ سے اڑتے ہیں رنگ بھی

ہم نے تری گلی میں زمانے کی سیر کی  
اور ہم نے اس کے سیکھ لیے رنگ ڈھنگ بھی



رقصِ سیارگاں نہیں رُکتا  
یہ تماشا میاں نہیں رُکتا

اک نہ اک داستان رہتی ہے  
یہ دلِ قصہ خواں نہیں رُکتا

حد سے آگے یقین نہیں جاتا  
پر کہیں بھی گماں نہیں رُکتا

سر کہیں بے سبب نہیں جھلتا  
دل کہیں رایگاں نہیں رُکتا

پاؤں سے جب زمیں سرک جائے  
سر پر پھر آسمان نہیں رُکتا

سنگِ زادوں کی بستیوں میں شناسَ  
کارِ شیشہ گراں نہیں رُکتا



میں یوں جہاں کے خواب سے تہاگزر گیا  
جیسے کہ ایک دشت سے دریا گزر گیا

یوں جگماً اٹھا ہے تری یاد سے وجود  
جیسے لہو سے کوئی ستارہ گزر گیا

گزرا مرے قریب سے وہ اس ادا کے ساتھ  
رستے کو چھو کے جس طرح رستہ گزر گیا

منظر میں گھل گئے ہیں دھنک کے تمام رنگ  
بے رنگ آئینے سے وہ لمحہ گزر گیا



ڈھونڈنے اُس کو کہاں جاتا ہے  
دل پس وہم و گماں جاتا ہے

آنکھ حیرت سے تکے جاتی ہے  
کس طرف آبِ رواں جاتا ہے

یاد کیا اُس کی گلی کو رکھئے  
دھیان سے اپنا مکاں جاتا ہے

زخم احساس پہ آ جائے اگر  
پھر کہاں اُس کا نشان جاتا ہے

اب تو ایسا ہے کہ میں کچھ بھی کہوں  
اُس کے حق میں ہی بیان جاتا ہے



زمیں پر نہ رہے آسمان کو چھوڑ دیا  
تمہارے بعد زمان و مکاں کو چھوڑ دیا

تباه کر گیا اک لمحہ خراب مجھے  
کہ میں نے حلقة آوارگاں کو چھوڑ دیا

کہیں پناہ نہیں ملتی لمحہ بھر کے لیے!  
کہ جب سے محفلِ دلدادگاں کو چھوڑ دیا

بس ایک گنجِ خس و خاک میں سکون ملا  
سو میں نے حلقة سیارگاں کو چھوڑ دیا

تمہارے بعد گذشتہ رہا نہ حال رہا  
سودل نے خدشہ آئندگاں کو چھوڑ دیا



اے دوست پہلے اپنی گواہی پہ غور کر  
پھر اس کے بعد میری تباہی پہ غور کر

پہلے تو اپنے جلتے چراغوں کی سمت دیکھ  
پھر ہر طرف سے بڑھتی سیاہی پہ غور کر

خیموں کی سمت آتی ہے تیروں کی باڑھ دیکھ  
پھر ظالموں کی پشت پناہی پہ غور کر

مت دیکھ میرے چہرے پہ اڑتے ہوئے یہ رنگ  
پہلے تو اپنی سرد نگاہی پہ غور کر



جانے کیسی ہے کشش بہتے ہوئے پانی میں  
ساتھ آنکھیں بھی چلی جاتی ہیں حیرانی میں

ہم جنوں زاد چلے آئے کہ دشت اپنا تھا  
درد کیوں ساتھ چلا آیا ہے نادانی میں

کتنا بے چین ہے دل جب سے ہوا اس کو  
فراغ

مطمئن کیسا رہا غم کی فراوانی میں  
کوئی خواہش تھی مری یا کہ پری تھی کوئی  
کبھی بادل میں نظر آئی کبھی پانی میں

خواب کچھ اور نظر آتا ہے تعبیر کے بعد  
حسن کچھ اور نظر آتا ہے عریانی میں



تم نے کتنی دیر لگا دی پاس ہمارے آنے میں  
ہم تبدیل ہوئے بستی میں اور بستی ویرانے میں



خواب کے شہر میں اک شخص ستارے جیسا  
نظر آیا تو سہی کوئی تمہارے جیسا

تشنگی جسم میں صحراء کی طرح پھیل گئی  
ہم کو دریا نظر آتا ہے کنارے جیسا

پھر بھی ہم لوگ گزارے ہی چلے جاتے ہیں  
ایک لمحہ بھی نہیں جب کہ گزارے جیسا



مرے نہ ہونے کا قصہ سنا گیا مجھ کو  
عجیب شخص تھا رستہ دکھا گیا مجھ کو

تمام حرف و ہنر اک طرف وہ ایک طرف  
بس اک نگاہ میں سب کچھ سکھا گیا مجھ کو

اور اب تو لگتا ہے ایسا بکھر ہی جاؤں گا  
کسی کے ہونے سے کتنا تھا حوصلہ مجھ کو

حدِ زمان و مکان سے نکل بھی سکتا ہوں  
اگر ملا نہ کوئی اور راستہ مجھ کو

وہ زندگی ہو کہ لڑکی ہو یا کوئی تسلی  
حسین لگتے ہیں سارے ہی بے وفا مجھ کو

کسی نے پیار سے اک بار مجھ کو دیکھا تھا  
سوتب سے دیکھتا رہتا ہے آئندہ مجھ کو

جو از مانگا تھا میں نے جہاں میں رہنے کا  
شناش اُس نے تماشا بنا دیا مجھ کو

نیند کے دشت میں آخر وہ گنوادے گا مجھے  
خواب دیکھے گا نہیں اور جگا دے گا مجھے  
جمع ہو جائیں گے سب حال و گذشتہ اک دن  
وہ اسی شہر کی گلیوں میں صدا دے گا مجھے



دولتِ درہم و دینار نہیں چاہتے ہم  
دیکھ، درویش ہیں تکرار نہیں چاہتے ہم

ہم آزل سے ہیں ہواؤں کی طرح محو سفر  
کوئی بھی لمحہ ہو بیکار نہیں چاہتے ہم

ضبط کی آخری منزل سے پکارا ہے تجھے  
جانِ جاں اب کوئی انکار نہیں چاہتے ہم

اپنی گردن پہ چلانا بھی اسے جانتے ہیں  
دیکھنے کے لیے تلوار نہیں چاہتے ہم



دنیا کسی خیال میں تبدیل ہو گئی  
ہر شے اسی ملال میں تبدیل ہو گئی

بس ایک بار دیکھا تجھے اور اس کے بعد  
ہر شے ترے جمال میں تبدیل ہو گئی

ملنا تھا کل جو غم وہ مجھے آج مل گیا  
فردا کی شام حال میں تبدیل ہو گئی

دنیا گھلی کتاب کی صورت رہی مگر  
ہر چیز اک سوال میں تبدیل ہو گئی



سمجھ رہا تھا میں یہ دن گزرنے والا نہیں  
گھلا کہ کوئی بھی لمحہ ٹھہرنا نہ والا نہیں

کوئی بھی رستہ کسی سمت کو نہیں جاتا  
کوئی سفر مری تیکمیل کرنے والا نہیں

ہوا کی ابر کی کوشش تو پوری پوری ہے  
مگر دھویں کی طرح میں بکھرنے والا نہیں

میں اپنے آپ کو بس ایک بار دیکھوں گا  
پھر اس کے بعد کسی سے بھی ڈرنے والا نہیں

چرائی جاں لیے کس دشت میں کھڑا ہوں میں  
کوئی بھی قافلہ یاں سے گزرنے والا نہیں

میں کیا کروں کوئی تصویر گر ادھوری ہے  
میں اپنے رنگ تو اب اس میں بھرنے والا نہیں



لمحہ لمحہ وقت ہمیں تقسیم کرے  
کون ایسے میں خوابوں کی تنظیم کرے

دیکھ رہا ہے بوند میں ایک سمندر کو  
جو ذرے سے صحراء کی تجسم کرے

ہر لمحہ الجھاؤ نیا پڑ جاتا ہے  
ہر لمحہ اک باب نیا تعلیم کرے

کبھی خوشی سے ہار کسی نے مانی ہے؟  
آخر دنیا کیوں ہم کو تسلیم کرے



آنکھوں میں زندگی کا نظارا تھا آخری  
ہر سانس ڈوبتا تھا کنارا تھا آخری

چلنے سکھایا اُس نے مجھے ہاتھ تھام کر  
تھی کیا خبر کہ اُس کا سہارا تھا آخری

آنکھوں میں خواب، خواب میں مہکے ہوئے گلاب  
لیکن وصال اُس سے ہمارا تھا آخری

لو آج سے ہوا یہ دبستانِ عشق بند  
میرا وجودِ غم کا ادارہ تھا آخری



برآمدے میں کھڑا رہوں گا  
میں آج اُس سے نہیں ملوں گا

جو تازہ حیرانیاں نہیں دے  
میں ایسے رستے پہ چل سکوں گا؟

جو تیری یادوں نے انگلی تھامی  
کسی کو ڈھونڈے سے کب ملوں گا

میں خود کو دیکھوں گا آئینے میں  
کہ دل کے سارے گلے سنوں گا

میں نور کا آخری نشان ہوں  
میں آخری سانس تک لڑوں گا

شاسَ چُپْ ہو اگر یہ دُنیا  
میں اپنی آواز سے ڈروں گا



راتے کب سے ہیں اپنے منتظر  
ہو چکی ہے شام چلنا چاہیے



دل و نگاہ میں اُس کو اگر نہیں رہنا  
شاسَ مجھ کو بھی پھر دربدر نہیں رہنا

اگر میں آؤں گا صدیوں کی عمر لاوں گا  
کہ تیرے پاس مجھے مختصر نہیں رہنا

یہ کائنات مری انگلیوں پہ ناچتی ہے  
مجھے ستاروں کے زیرِ اثر نہیں رہنا

میں جانتا ہوں مگر دل کو کون سمجھائے  
شاسَ اُس کو مرا ہم سفر نہیں رہنا



بانہوں کے حلقة میں وہ پری زاد ہووے گی  
پھر اس کے بعد زندگی دل شاد ہووے گی

جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے  
دنیا، ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی

جب اک هجوم دل میں سمیئے ہوئے ہوتم  
پھر اس کی یاد کس طرح آباد ہووے گی

کیا سوچنا کہ کھول دو گھر کے تمام در  
کیا دیکھنا کہ پھر کوئی افتاد ہووے گی

پھر کس کے ساتھ شہر کے رستوں پہ بھٹکے گی  
گراس زمیں پہ رات مرے بعد ہووے گی

عشاق ہم سے کتنے ہی برباد ہو گئے  
 تم ہی بتاؤ کیا وہ گلی شاد ہووے گی  
 پھر اس کے بعد راستہ ملنا نہیں کوئی  
 لا حاصلی جو حاصلِ ایجاد ہووے گی

دستاریں رنگ رنگ کی دیکھوں تو ہو گماں  
 کیا ساری کائنات ہی بغداد ہووے گی

اب ہم بھی خود کو بھولے سے آتے نہیں ہیں یاد  
 سو تم کو کوئی بات، کہاں یاد ہووے گی



چراغِ شامِ غریب اُن نظر میں رہتا ہے  
لہو جھو ہے ہمیشہ سفر میں رہتا ہے

اُسے جو دیکھوں تو بس اُس کو دیکھتا جاؤں  
وہ حُسنِ خاص بڑے کرز و فر میں رہتا ہے

تمہارے خواب مرے رنجگوں میں جا گتے ہیں  
تمہارا چہرہ مری چشمِ تر میں رہتا ہے

ستارے شام سے اب آنکھیں موند لیتے ہیں  
عجب سکوت سا دیوار و در میں رہتا ہے

نہیں ہے وہ تو یہاں گفتگو کریں کس سے  
ہمارا دھیان تو اُس کی خبر میں رہتا ہے

یہاں پہ جو بھی ہے مجبور ہے ہماری طرح  
بس ایک گردشِ شام و سحر میں رہتا ہے

کبھی یہاں بھی وفا نہیں نہائی جاتی تھیں  
یہ شہرِ خاک جو اب سور و شر میں رہتا ہے

تجھے بھی ہو کبھی احساس اپنی حالت کا  
شناش تو جو غبارِ سفر میں رہتا ہے



شاسَ خوار ہوئے اور بس ہوئے یونہی  
ہم اُس گلی میں رہے اور بس رہے یونہی

عذاب در بدروم، کب کسی سے اٹھتا ہے  
سو ہم ہی آگے بڑھے اور پھر جیے یونہی

میانِ آتش و فردوس اک مقام جو ہے  
وہاں پہ خواب تھے میرے کہ جو رہے یونہی

لہو میں شوق کا اک رقص تھا جو جاری تھا  
پران کے سامنے لب بستہ ہم رہے یونہی



کم کسی طور یہ وحشت نہیں ہونے والی  
عمر بھر اب ہمیں فرصت نہیں ہونے والی

اپنا ہر خواب ترے نام کیا ہے میں نے  
اب کوئی اور سخاوت نہیں ہونے والی

زندگی بھر میں اُسے ایک ہی خط ہم نے لکھا  
اور ایسا کہ وضاحت نہیں ہونے والی

اب کوئی پھول کبھی ایسا نہیں کھل سکتا  
ترے جیسی کوئی صورت نہیں ہونے والی

اُس کو بھی دل سے بھلانے کا ارادہ ہے شناس  
سوچ لو پھر کوئی حسرت نہیں ہونے والی

رقصِ سیارگاں کو دیکھتا ہوں  
اور پھر جسم و جاں کو دیکھتا ہوں

سر اٹھاتی ہے خواہشِ تعمیر  
جب بھی گرتے مکاں کو دیکھتا ہوں

اک تمنا کے سادہ خاکے میں  
رنگ بھرتے خزاں کو دیکھتا ہوں

خواہشوں کے سنہرے دریا میں  
دل کے تختِ رواں کو دیکھتا ہوں

تیری آنکھوں کو جب سے دیکھا ہے  
 جانے میں کس جہاں کو دیکھتا ہوں  
 سر قرطاسِ خوب سجا کے شناس  
 کاوشِ رائیگاں کو دیکھتا ہوں

ناامیدی ہے دیدنی اُس کی  
 جس کو اپنا بھی انتظار نہ ہو



اپنے ہونے پہ بھی شرمندہ رہے  
باوجود اس کے بھی ہم زندہ رہے

کار آس کی طرف دیکھا نہیں  
کار دشوار کے جوئندہ رہے

خواب اور پھول اُسے دے آنا  
اُس سے محفل اگر آئندہ رہے

اپنی تصویر سے باتیں کر کے  
اپنے ماحول میں ہم زندہ رہے

رُوپ بھروپ بدلتے آئے  
حرف ہر عہد میں پائندہ رہے

یونہی اک روز بکھر جاؤ گے  
یونہی گر اپنے سے شرمندہ رہے



دل میں تیرا خیال ہے تا حال  
وہی پہلا سا حال ہے تا حال

وہ ہی انکار اس کی آنکھوں میں  
وہ ہی میرا سوال ہے تا حال

بھولنا اس کو لمحہ مشکل  
اور پانا محال ہے تا حال

آج تک میں اسی زمین پہ ہوں  
وہ دھنک کی مثال ہے تا حال

اے میجا نفس! ترے لب سے  
زخم کا اندماں ہے تا حال



اب تو یوں ہے کہ زمانے سے بچا گئیں خود کو  
درود یوار کے پردے میں چھپا گئیں خود کو

نیند آواز پہ آواز دیے جاتی ہے  
اور ہم شہر کی گلیوں میں بلا گئیں خود کو

ایک مدت سے یہی کام کیے جاتے ہیں  
اپنی تکمیل کریں اور مٹا گئیں خود کو

وہ کوئی دل ہو کہ صمرا ہو مگر ایسا ہو  
ایسے کھوجا گئیں کہ ڈھونڈے سے نہ پائیں خود کو

حُبس ایسا ہے کہ دل ڈوب رہا ہو جیسے  
چھوڑ آئیں کسی جنگل میں ”ہوا نہیں“ خود کو

دن نکلتا ہے تو یہ لوگ جلانے آئیں  
شام ڈھل جائے تو ہم لوگ جلا نہیں خود کو



نجانے کون سی افتاد آ پڑی غم پر  
ہم ایسے ہجر نصیبوں کے گھر چلا آیا



ہے زمیں میری سمندر میرا  
تو بھی ہوتا جو مقدر میرا

پھر یہاں کیا مرے ہونے کا جواز  
جب نہیں کوئی بھی منظر میرا

سانچے اتنے تسلل سے ہوئے  
دل ہوا جاتا ہے پتھر میرا

وہ کہاں ہے؟ یہ ہوا پوچھتی ہے  
راستہ روک کے اکثر میرا

کتنی صدیوں میں ہوا یہ احساس  
کوئی مجھ سے نہیں بہتر میرا

یہ زمانہ تو مرا کیا ہوگا  
کاش ہو جائے مرا گھر میرا

## O

ترے لبوں کی طراوت سے بزر ہے مرادل  
مرے لیے تو نمو کا ہیں سلسلہ ترے لب  
ہر ایک منظر بے خواب کا مقدر ہیں  
دعا دعا تری آنکھیں، صداصدا ترے لب



کہیں ہو جائے اب یہ راستہ تبدیل ممکن ہے  
ادھورے خواب کی اس طرح بھی تکمیل ممکن ہے

لہو میں سرسراتی آہٹوں کے پھول کھلتے ہیں  
یہ لگتا ہے نئی دنیا کی اب تشکیل ممکن ہے

ستارے جاگتے ہیں آسمان کی پابندی کو  
مگر یوں ہو بھی سکتا ہے کوئی تعجیل ممکن ہے

شب ہجرالاں اگر گزری تو اس کے بعد دیکھیں گے  
اگر تیرے کسی فرمان کی تعییل ممکن ہے

غبار رہگز رکھہ را ہوں میں اُس کی محبت میں  
 بتا اس سے زیادہ کیا مری تشكیل ممکن ہے

ازل سے تا ابد ” ہونا نہ ہونا ”، ایک جیسا تھا  
 شناس اس واقع کی کیا کوئی تاویل ممکن ہے



حصارِ ذات سے آگے نکل رہا ہے کوئی  
فضائے کون و مکاں کیا بدل رہا ہے کوئی

جہاں سکوت میں ڈوبا ہوا سمندر ہے  
وہیں پہ ایک ستارہ ساجل رہا ہے کوئی

جہاں خیال پہ طاری جمود ہو جائے  
صدائی کی طرح وہاں پہ مچل رہا ہے کوئی

کہیں پڑاؤ ہوا تو ملوں گا میں اُس سے  
ہر ایک لمحہ مرے ساتھ چل رہا ہے کوئی

نہ جانے آئی ہے کیسی یہ مجھ میں تبدیلی  
کہ بات کرنے کو مجھ سے مچل رہا ہے کوئی



میان بحر و بر جیرت ہے میری  
مرا سارا سفر جیرت ہے میری

میں ہر قیمت پہ اُس سے جا ملوں گا  
تلاشِ بے خبر جیرت ہے میری

بدن کیا سائے بھی جلنے لگے ہیں  
سلگتی دوپھر جیرت ہے میری

وہ کب کا سامنے بھی آچکا ہے  
مگر محو سفر حیرت ہے میری

مرے سب کام اُس کے ہاتھ میں ہیں  
نہ یہ مٹی نہ زر حیرت ہے میری

شاسَ اب تک یہی سمجھا ہے میں نے  
مرا سارا ہنر حیرت ہے میری



کوئی یاد تھی کہ غزل میر کی  
بہت دیر تک گنگنائے گئے  
جہاں چار جانب رہا پھیلتا  
مگر ہم تو خود میں سائے گئے



غم کی تصویر بنانے میں بہت دیر لگی  
اور پھر اُس کو دکھانے میں بہت دیر لگی

اُس سے آسان نہ تھی رسمِ تعارف بھی مگر  
بات کو آگے بڑھانے میں بہت دیر لگی

دیکھ کر آج اُسے حال ہوا کچھ ایسا  
دل کو معمول پہ آنے میں بہت دیر لگی

اتنا مشکل بھی نہ تھا کام مگر تیرے بعد  
اک دیا مجھ کو جلانے میں بہت دیر لگی

بارے اس بار تری بات وہ یاد آئی مجھے  
جس کو افسانہ بنانے میں بہت دیر لگی



کبھی کبھی تو یقین سے بھی کوئی بات کرو  
ہر اک مقام پہ کرتے نہیں ہیں اندازہ



ازل سے آج تک خود سے ہی نہاں ہوں میں  
جواب دے مجھے آئینے، اب کہاں ہوں میں

مجھے نہ سوچ، کہ میں ہوں بکھرتا بتا خواب  
مجھے نہ دیکھ، کہ اک نقشِ رایگاں ہوں میں

مجھے نہ ڈھونڈ، کہ میں ہوں گزرتا اک لمحہ  
ابھی تو ”ہونے نہ ہونے“ کے درمیاں ہوں میں

مرے وجود میں رقصان ہے عشق کی حدت  
مرے قریب نہ آ، آگ ہوں دھواں ہوں میں

خود اپنے آپ کو میرا وجود بوجھ لگے  
اذیتوں کی نئی راہ پر رواں ہوں میں

## ○

فضا میں اڑتے پرندو، ہماری بات سنو!  
زمیں پہ آگ لگی ہے اڑان میں رہنا



ڈھنڈ میں ڈوبی ساری فضا تھی اس کے بال بھی گلے

تھے

جس کی آنکھیں جھیلوں جیسی جس کے ہونٹ ریلے تھے

جس کو کھو کر خاک ہوئے ہم، آج اُسے بھی دیکھا تو  
ہنستی آنکھیں افسردہ تھیں، ہونٹ بھی نیلے نیلے تھے

جن کو چھو کر کتنے زیادی اپنی جان گنوا بیٹھے

میرے عہد کی شہناز دل کے جسم بڑے زہر میلے تھے  
آخر آخر ایسا ہوا کہ تیرا نام بھی بھول گئے  
اول اول عشق میں جانان ہم کتنے جو شیلے تھے

آنکھیں بجھا کے خود کو بھلا کے آج شناس میں آیا ہوں  
تلخ تھیں لبھوں کی برساتیں رنگ بھی کڑوے کیلے تھے

## O

دنیا پہ رنگ اپنے اُتارے نہیں گئے  
ہم زندگی سے گزرے گزارے نہیں گئے



نگار خانہ ابر و ہوا پسند آیا  
میان آتش و فردوس تھا، پسند آیا

شریک بزم بہت سے حسین لوگ بھی تھے  
نہ جانے کیوں ہمیں چہرہ ترا پسند آیا

وہ شخص آگ تھا، شب نم تھا اور خوشبو تھا

ہر ایک رُوپ میں ہم کو سدا پسند آیا  
 طلب میں اُس کی جو بھرا جو اُس کی سمت چلا  
 خدائے عشق کو وہ نقشِ پا پسند آیا

یہ روز مرنے کی لذت کہاں بقا میں تھی  
 ہمیں تو نشہ آب فنا پسند آیا

جہاں سلگتے رہو جل سکو نہ راکھ بنو  
 کچھ اس طرح کا ہمیں کربلا پسند آیا

شاسَ چھایا ہوا تھا مہیب سنائا  
 سو ایسے میں دلِ نغمہ سرا پسند آیا



ہاتھوں میں پھول، آنکھوں میں سپنا لیے ہوئے  
ہم بھی ہیں اپنے آپ میں دنیا لیے ہوئے

پھر اُس پہ رنگ کی پرچھائیاں ملیں  
نکلے تھے گھر سے ہم دل سادہ لیے ہوئے

شاید وہ لمحہ بھر کو اُسی طرح دیکھ لیں  
ہم آگئے ہیں اپنا تماشا لیے ہوئے

یہ ظرف کی ہے بات مری بے بسی نہیں  
ہر لمحہ میری پیاس ہے دریا لیے ہوئے

کر آئے تیرے ہجر کا ہر مرحلہ عبور

آنکھوں میں دھول، پاؤں میں رستہ لیے ہوئے  
 تعبیر کی سحر نہ کبھی مل سکی ہمیں  
 آئے تھے خواب آنکھوں میں کیا کیا لیے ہوئے

پھر یوں ہوا شناس کہ خود کو گنوa دیا  
 آئے تھے ہم جو اُس کی تمنا لیے ہوئے



اک کہانی ہے سناؤں تو سنا بھی نہ سکوں  
بات اس موڑ پہ آئی ہے بنا بھی نہ سکوں

خواب اک روز بکھرنا ہے، مجھے مرنा ہے  
دل کو اس آگ میں جلانا ہے بجھا بھی نہ سکوں

درد یوں پھیلا دل و جاں میں سمیٹنے نہ بنے

دھوپ یوں بکھری ہے رستے میں اٹھا بھی نہ سکوں  
 تیرے جانے کا بھی منظر نہیں بھولا لیکن  
 تیرے لوٹ آنے کا امکان بھلا بھی نہ سکوں

لوگ مسماں کیے دیتے ہیں اب دیر و حرم  
 میں تو اک یاد کی دیوار گرا بھی نہ سکوں



مٹی کی عدالت کی سزا اتنی کڑی تھی  
 ہم لوگ بہت دور مرے اپنے وطن سے



خُن الفاظ کے پیکر میں اگر آسکتا  
کیسا ہوتا ہے خدا تم کو میں دکھلا سکتا

اُس سفر پہ ہوں کہ ہلکاں ہُوا جاتا ہوں  
اور کہاں جانا ہے یہ بھی نہیں بتلا سکتا

ہارنا بھی ہے یقینی پہ مری فطرت ہے  
ایک ہی چال ہمیشہ نہیں دُھرا سکتا

زندگی اب تو مجھے اور کھلونے لا دے  
ایسے خوابوں سے تو میں دل نہیں بہلا سکتا

میں بھی تقدیر کے لکھے پہ یقین لے آتا  
وقت اک بار جو اُس سے مجھے ملوا سکتا



نواحِ سامرہ اور نینوا کے پیچ کہیں  
بکھر گئے تھے حصارِ دعا کے پیچ کہیں

مرا بھی گھر تھا گلِ عافیت سے مہکا ہوا  
اسی نگر اسی شہر بلا کے پیچ کہیں

وہ شام ڈوب گئی رات کے سمندر میں  
وہ چہرہ کھو گیا ابر و ہوا کے پیچ کہیں

وہ خواب ٹوٹ گیا جس سے نیند تھی آباد

وہ شخص کھو گیا ارض و سما کے پیچ کہیں  
ہمارا ہونا نہ ہونا عجائب فسانہ ہے  
ٹھہر گئے ہیں بقا و فنا کے پیچ کہیں

چہار سمت سے آتی رہی کوئی آواز  
میں دوڑتا رہا دشتِ صدا کے پیچ کہیں

یہ اور بات کہ سکہ روائی اُسی کا ہے  
شناس ہم بھی ہیں عہدِ رسما کے پیچ کہیں



کربلا بھی فرأت ہم نے کی  
دیکھیے کیا حیات ہم نے کی

کیسی یہ کائنات ہم کو ملی  
کیسی یہ کائنات ہم نے کی

گفتگو اس سے اور کرنی تھی  
اس سے کچھ اور بات ہم نے کی

و

صل کی ایک شب تھی ایک ہی شب  
بس اسی میں حیات ہم نے کی

اور بھی کچھ بکھر گئے ہیں شناس  
جب سمنے کی بات ہم نے کی



قصہ دل ہے ناتمام ابھی  
مجھ کو کرنا ہے کچھ کلام ابھی

کون آواز دے رہا ہے مجھے  
ڈور ہے دوپھر سے شام ابھی

کیسے ہم اس کو راہ پر لاتے  
اپنا دل ہی ہوا نہ رام ابھی

کون میرے قریب سے گزرا  
کس نے مجھ کو کیا سلام ابھی

کیا بتاؤں میں حال دنیا کا  
راتے میں ہیں صبح و شام ابھی  
زندگی دُکھ بھرا ڈرامہ ہے  
اس کا ہو جائے اختتام ابھی

ایک دن دار پر بھی کھینچیں گے  
وہ جو کرتے ہیں احترام ابھی



اک منظر خوش رنگ دکھا جاتا ہے پانی  
بہتا ہوا چپ چاپ چلا جاتا ہے پانی

اے زخمِ جگر! خون کی اک بوند عطا کر  
اب آنکھوں میں آنے سے رہا جاتا ہے پانی

جو بعدِ ازلِ سُن نہ سکے آج تلک ہم  
فطرت کا وہی گیت سنًا جاتا ہے پانی

سب جھوٹے ہیں جو مہر و محبت کے ہیں دعوے  
انسان کی آنکھوں کا مرا جاتا ہے پانی

تہائی میں تصویریں دکھاتا ہے بہت سی  
اک خانہ نیرنگ بنا جاتا ہے پانی



منتظر اُس کے شامِ وعدہ رہے  
یونہی تا دیر سر نہادہ رہے

دیکھ کر بھی ہماری حالتِ دل  
ان کے الفاظ کتنے سادہ رہے

ہم سے بھی رسمِ قیسِ چھٹ نہ سکی  
درد بھی پیش پا فتادہ رہے

کب یہ چاہا تھا کب یہ سوچا تھا  
چاہتے اس کو بے ارادہ رہے

سرد سے اور ہجر کی شب سے  
اس کی خوش قامتی زیادہ رہے

چاند کب میری دسترس میں تھا  
میرے بازو مگر کشادہ رہے



درد کی لہر اٹھائے لیے جاتی ہے مجھے  
رنگ کی موج بہائے لیے جاتی ہے مجھے

جانے کس سمت چلی جاتی ہے پُر شور ہوا  
اور وحشت میں اڑائے لیے جاتی ہے مجھے

رنگ سے رنگ چرانا کوئی آسان تو نہیں  
زندگی مجھ سے چرائے لیے جاتی ہے مجھے

زندگی گزری ہے روٹھے ہوئے بچ کی طرح  
موت کس طرح منائے لیے جاتی ہے مجھے  
میں نہ شاعر، نہ مغنی، نہ کوئی صورت گر  
کس کی آواز بلائے لیے جاتی ہے مجھے

ڈھوپ سی تیز دھنی ہوئی وحشت کوئی  
کس کی دیوار کے سائے لیے جاتی ہے مجھے

## ○

مری آنکھیں اٹاٹھے ہیں تمھارا  
کہ میں نے خواب دیکھے ہیں تمھارے



اول اول تھے ہم محبت کے  
آخر آخر ہوئے ہیں وحشت کے

راتے ہم کو یاد کرتے ہیں  
دکھ اٹھائے ہیں اتنے بھرت کے

یوں بھی ہم عشق میں ہوئے ناکام  
ورشہ دارانِ تھے روایت کے

تم ہمارے مزاج کے کب تھے  
ہم بھی کب تھے تمہاری عادت کے

حسن اُس کا نیا نیا ہر پل  
 عشق میں ہم ہیں اپنی حالت کے  
 تم کو میں بار بار دیکھتا ہوں  
 ہیں سبھی رنگ تم میں حیرت کے

چار سو دوڑتا رہا ہوں میں  
 رستے بدلتے نہیں ہیں قسمت کے

تیرے دستِ ہنر کی خیر شناسَ  
 کو زہ گر ہم رہے ہیں فرصت کے

[نذر جون ایلیا]



لہو میں آگ، نظر میں دکتی بے خوابی  
ہزار رنگ بدلتی ہے دل کی بے تابی

کسی چراغ کی لوڑھونڈتی ہے اب مجھ کو  
ہواۓ شام کو کھلتی ہے میری کمیابی

ہر اک قدم پہ نیا تجربہ ہوا مجھ کو  
ہر ایک لفظ مرا ہو گیا ہے تیزابی

یہ کائناتِ دل و جاں اُسی کی ہے لیکن  
کسی مقام پہ ٹھہرے نگاہِ سیماں

کچھ اس کمال سے اُترے تھے ہم سمندر میں  
پھر اُس کے بعد ہوئی ختمِ رسمِ غرقابی

تمہاری آنکھ نے ایسا سخن کیا تعلیم  
 ہر ایک لفظ ہے سرمست اور مے نابی  
 کچھ اس ہنر سے ترے بھر سے گزر آئے  
 کہ حرف آگ ہوئے اور لہجہ برفانی

یہ عشق ہے کہ ہے صحرائے بے کنار شناس  
 کہ اس کی پیاس میں ڈوبی ہوئی ہے سیرابی



ہر ایک سمت ہے تو اور نگار خانہ وہی  
جنوں وہی تری یادوں کا کارخانہ وہی

وہی ہماری ہے شوریدگی و بے تابی  
سلوک ہم سے تمھارا مسافرانہ وہی

سوائے عشق ہمارا شریک کوئی نہیں

بس اک تعلق بے نام و غائبانہ وہی  
بس ایک پل تری قربت کا زندگی جیسا  
پھر اس کے بعد وہی میں ہوں اور زمانہ وہی

پھر اس کے بعد تراویل بھی خیال و خواب  
پھر اس کے بعد ہر اک رات بیکرانہ وہی

ہزار بدلا زمانہ ہزار بدلا جہاں  
مگر نصیب ہے اپنا پیغمبرانہ وہی

وہی ہے جبر زمانہ وہی خدا کے لوگ  
وہی ہے آگ، سلگتا ہوا گھرانہ وہی

ہر اختیار پر بے اختیار قابض ہیں  
ہر اقتدار پر قبضہ ہے غاصبانہ وہی

وہی ہے طوق وہی قافلہ وہی دربار  
وہی ہے رستہ ہمارا ہے تازیانہ وہی

بدل گیا ہے بہت میرے عشق کا انداز  
لہو میں جاری ہے رقصِ قلندرانہ وہی

اگرچہ چھین لیا ہے جہان نے سب کچھ  
ہے پھر بھی لجھ و کردار باغیانہ وہی

شاس جس کے لیے چھوڑ آئے ہم دنیا  
ہزار لوگ ملے ایک بس ملا نہ وہی



جانے کس لہر میں تھا کوڑہ گر  
خاک ہوتی رہی ادھر سے اُدھر

موت کا دبدبہ ہے اپنی جگہ  
زندگی کا ہے اپنا کرز و فر

آڑی ترچھی سی کچھ لکیریں ہیں  
زندگی کے سپاس نامے پر

وہ مسافر عجیب ہے جس کا  
راستہ دیکھتی ہے راہ گزر

آدمی اور خدا کے بیچ شناس  
آگیا ہے کہاں سے جانے شر

## ○

ذات سے انحراف کون کرے  
اپنے دل میں شگاف کون کرے  
رایگاں کر دیا گیا ہے مجھے  
ہاں مگر اعتراف کون کرے



رستے میں شام ہو گئی قصہ تمام ہو چکا  
جو کچھ بھی تھا اے زندگی وہ تیرے نام ہو چکا

کب کا گزر گئی وہ شب جس میں کسی کا نور تھا  
کب کی گلی میں دھوپ ہے جینا حرام ہو چکا

پھرتے رہیں نگر نگر کوچہ پہ کوچہ در پہ در  
اپنے خیام جل چکے اپنا سلام ہو چکا

رات میں باقی کچھ نہیں نیند میں باقی کچھ نہیں  
اپنا ہر ایک خواب تو نذرِ عوام ہو چکا

اس کے لبوں کی گفتگو کرتے رہے سبو سبو

یعنی سُخن ہوئے تمام یعنی کلام ہو چکا  
 عشق گرا ایسا عشق ہے آنکھوں سے بہنے دلو ہو  
 زیست گرائی زیست ہے اپنا تو کام ہو چکا

رستے تمام ہو گئے اس کی گلی کے آس پاس  
 یعنی خرام ہو چکا یعنی قیام ہو چکا

روشنی تھی کھلے دریچوں میں  
خامشی گونجتی تھی رستوں میں

جانے ہم ایک تھے کہ بے حد تھے  
بٹ گئے ہیں تمام رشتوں میں

ہم محبت کی وسعتوں میں رہے  
لمحے گزرے ہیں کیسے لمحوں میں

ایک آواز کے تعاقب میں

دُورتا پھر رہا ہوں گلیوں میں  
 ایک دستک سی دل پہ جاری ہے  
 اور سائے اداں گلیوں میں

خود سے باہر کبھی نکل کے شناسَ  
 ڈھونڈیئے زندگی کو لوگوں میں



لہو کی لہر میں اک خواب دل شکن بھی گیا  
پھر اس کے ساتھ ہی آنکھیں گئیں بدن بھی گیا

بدلتے وقت نے بد لے مزاج بھی کیسے  
تری ادا بھی گئی میرا بانکپن بھی گیا

بس ایک بار وہ آیا تھا سیر کرنے کو  
پھر اس کے ساتھ ہی خوشبو گئی چمن بھی گیا

بس اک تعلق بے نام ٹوٹنے کے بعد  
سخن تمام ہوا رشتنا سخن بھی گیا



دلِ تباہ کو اب تک نہیں یقین آیا  
کہ شام بیت گئی اور تو نہیں آیا

جہاں سے میں نے کیا تھا کبھی سفر آغاز  
میں خاک دھول ہوا لوٹ کر وہیں آیا

وہ جس کے ہاتھ سے تقریبِ دل نمائی تھی  
ابھی وہ لمحہ موجود میں نہیں آیا

بس ایک بار مری نیند چھو گیا کوئی  
پھر اس کے بعد ہر اک خواب دلنشیں آیا

بچھڑ کے تجھ سے تری یاد بھی نہیں آئی

مکاں کی سمت پلٹ کر مکیں نہیں آیا



ایسے دنیا میں کسی کا بھی گزارا ہوا ہے  
جس طرح ہم نے تجھے دل سے اُتارا ہوا ہے

یہ الگ بات کہ حالات وہی ہیں اب بھی  
تیرے آنے سے مگر کچھ تو سہارا ہوا ہے

مجزہ ہے کہ محبت کا کرشمہ کوئی  
آنکھ سے اشک گرا اور ستارا ہوا ہے



اُس نے پوچھا بھی مگر حال چھپائے گئے ہم  
اپنے ہی آپ میں اک حشر اٹھائے گئے ہم

زندگی دیکھ کہ احسان ترے کتنے ہیں  
دل کے ہر داغ کو آئینہ بنائے گئے ہم

پھر وہی شام، وہی درد، وہی اپنا جنوں  
جانے کیا یاد تھی وہ جس کو بھلائے گئے ہم

کن دریچوں کے چراغوں سے ہمیں نسبت تھی  
کہ ابھی جل نہیں پائے کہ بجھائے گئے ہم

عمر بھر حادثے ہی کرتے رہے استقبال  
وقت ایسا تھا کہ سینے سے لگائے گئے ہم

راتے دوڑے چلے جاتے ہیں کن سمتوں کو  
دھوپ میں جلتے رہے سائے بچھائے گئے ہم

دشت در دشت بکھرتے چلے جاتے ہیں شناس  
جانے کس عالمِ وحشت میں اٹھائے گئے ہم

آپِ اس وقت ہیں جہاں بابا  
اس کا کوئی نہیں نشاں بابا

دشتِ شفقت اُٹھا لیا تم نے  
ہم ہیں اور دشت بے اماں بابا

کیسا ویران ہو گیا دالان  
کتنا خاموش ہے مکاں بابا

آپ نے کس یقین سے بتلایا  
ہے گماں ہی گماں جہاں بابا

خواب ٹوٹے بکھر گئے تارے  
سب کی آنکھیں ہیں کہکشاں بابا

پھر ملیں گے ذرا سا دم لے کر  
کچھ مسافت ہے درمیاں بابا

دھوپ میں آگئے اچانک ہم

آپ تھے ہم پہ سائیاں بابا  
 ایک اک لمحہ سونپ دیتا تمہیں  
 ملتی گر عمرِ جاوداں بابا

آپ جیسا کوئی کہیں کیوں ہو  
 آپ جیسا کوئی کہاں بابا

موت سے پہلے کیوں رہے خاموش  
 خامشی کی تیٹھی کیا زباں بابا

سات نمبر کا بیڈ خالی ہے  
 ڈھل گئی شام ہو کہاں بابا

آپ سے کب گلے ملے گا شناسَ  
 ختم کب ہوگی داستان بابا

[والد صاحب کی وفات پر]

## جمالیات کا شاعر

”سارا جہاں آئینہ ہے“ کے دس سال بعد فہیم شناس کاظمی کا دوسرا مجموعہ کلام ”خواب سے باہر“ منظر پر آ رہا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری اس کا مسئلہ ہے، مشغله نہیں۔ وگرنہ اس کے کئی مجموعہ شائع ہو چکے ہوتے۔

”سارا جہاں آئینہ ہے“ سے ”خواب سے باہر“ تک شناس کے ہاں مسلسل ارتقائی سفر نظر آتا ہے اور اب میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فہیم شناس کاظمی کی غزل میں غزل اپنی پوری تہذیب کے ساتھ دلکشی نظر آتی ہے۔ غزل کے بنیادی عنصر جمالیات اور تغزل ہیں اور وہ فہیم شناس کی غزلوں میں موجود ہیں۔ ان غزلوں میں روایت اور کلاسک کی جملکیاں بھی جا بجا نظر آتی ہیں، لیکن فہیم شناس کے اسلوب میں تازگی اور نیا پن نمایاں ہے۔

اس مجموعہ کلام کے سرسری مطالعے سے جوشور مجھے اچھے لگے ہیں، وہ یہ ہیں۔

تمام عمر ہوا کی طرح گزاری ہے  
اگر ہوئے بھی کہیں تو کبھو کبھو ہوئے ہم

-----

جانے کس لہر میں تھا کوزہ گر  
خاک ہوتی رہی ادھر سے ادھر

-----

تتلی کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں لمحے  
پھولوں کی طرح دیکھتے رہتے ہیں انھیں ہم

-----

خامشی اتنی رہی یہ مجھ میں  
گفتگو ڈوب گئی ہے مجھ میں

-----

ایک بس تم ہی نئے آئے ہو  
اور سب کچھ تو وہی ہے مجھ میں

-----

روز کاغذ پہ دل بناتا ہوں  
پھر اسے آگ میں جلاتا ہوں

-----

پھر بھی ہم لوگ گزارے ہی چلے جاتے ہیں  
ایک لمحہ بھی نہیں جبکہ گزارے جیسا

-----

اگر عشق میں کام آتا نہیں  
تو کس کام نام و نسب آئے گا

اس مجموعہ کلام میں ایسے اشعار کا موجود ہونا یقیناً شاعر کے روشن مستقبل کی نوید ہے۔  
رسا چغتائی

## زندگی کی کلیت کا شاعرانہ اظہار

شاعراً ز خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا، حیثیت دراصل اُس احساس کی ہوتی ہے جو شاعر کے اندر پروان چڑھتا ہے اور ایک روح کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ روح دراصل شاعری ہوتی ہے، اور شاعر وہی کہتا ہے جو یہ روح اس سے کھلوانا چاہتی ہے۔ گویا شاعر اور شاعری اپنے تعارف میں دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں جو باہم اشتراک عمل سے اپنا اظہار یہ طے کرتی ہیں۔ ہر کلام موزوں جو شعری قواعد و ضوابط اور تکنیک پر پورا اترتتا ہو، شعر ہو سکتا ہے، لیکن وسیع تر معنی میں اسے شاعری نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ شاعری وہ ہوتی ہے جس پر شاعر کے احساسات کا گہرائسایہ ہو، اور جس میں شاعر زندگی کی کلیت کے ساتھ ظاہر ہو رہا ہو۔ ایسی کلیت جو شاعر کے شخصی طرزِ ادراک کی نمائندہ ہو۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر کسی شاعر کی انفرادیت متعین ہوتی ہے اور اس کے کلام موزوں کو ہم شاعری کہتے ہیں۔ ویسے کوئی منفرد شاعر جسے شاعری نے خود اپنے لیے منتخب کیا ہو، شاذ شاذ ہی ظہور کرتا ہے۔ یہ گفتگو میں نے ایک نوجوان شاعر فہیم شناس کاظمی کی شاعری پر اظہار خیال کی ابتداء کے طور پر کی ہے، جس کے دوسرے شعری مجموعے ”خواب سے باہر“ کا مسودہ میرے پیش نظر ہے۔ میں نے فہیم شناس کی شاعری کا منفرد اظہار کے ایسے اصول کے تحت جائزہ لیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے ہاں کلام موزوں کس قدر ہے اور شاعری کتنی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ فہیم شناس کے ہاں کلام موزوں کی مقدار کم ہے، جب کہ شاعری کی فراوانی ہے۔ میں اس گفتگو کو ضمنی و ذیلی مباحث کے حوالے سے طول بھی دے سکتا ہوں لیکن یہاں مقصد

چوں کہ فہیم شناس کے کلام موزوں کوشاعری میں مخفی ان محکات کو تلاش کرنا ہے جنھوں نے فہیم شناس کے کلام موزوں کوشاعری میں ڈھال دیا ہے اور شاعری بھی وہ جسے ہم عصری تناظر میں قابل ذکر شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں فہیم شناس کے کچھ شعرا پنی رائے کی وضاحت میں پیش کروں ایک اور بات جو میرے ذہن میں دیر سے موجود ہے، اس کا اظہار کر دوں اور وہ یہ بات ہے کہ شاعری کی باطنی کش مکش ہی دراصل شاعر کو وہ شعری مواد فراہم کرتی ہے جس کی بنابر شاعر کی انفرادیت ظہور کرتی ہے۔ نئی عالمتوں، استعاروں، تمثالي پیکر اور اجنبی تلازمات سے انوکھا پن تو شاعر کے کلام میں پیدا ہو جاتا ہے لیکن شاعری پیدا نہیں ہوتی۔ شاعری دراصل اس منفرد محسوساتی تجربے سے پیدا ہوتی ہے جسے میں نے اوپر باطنی کش مکش لکھا ہے۔ میں نے فہیم شناس کے ہاں باطنی کش مکش کے شاعرانہ اظہار کی فراوانی دیکھی ہے۔ جو یقیناً ان کے ایک قابل ذکر شاعر ہونے کا پتا دیتی ہے۔ آئیے کسی تشریحی تفصیل میں جائے بغیر میں آپ کو فہیم شناس کے کچھ شعر ناؤں، تاکہ میرے موقف کی مزید وضاحت ہو سکے۔

روز کاغذ پہ دل بناتا ہوں  
پھر اسے آگ میں جلاتا ہوں

----

اپنی تصویر سے باتیں کر کے  
اپنے ماحول میں ہم زندہ ہیں

----

وہ کہاں ہے یہ ہوا پوچھتی ہے  
راستہ روک کے اکثر میرا

----

ایک دنیا ہمیں خراب ملی  
ایک دنیا کو ہم خراب ملے

----

مرے وجود میں رقصان ہے عشق کی حدت  
مرے قریب نہ آ، آگ ہوں دھواں ہوں میں

-----

پھر بھی ہم لوگ گزارے ہی چلے جاتے ہیں  
ایک لمحہ بھی نہیں جب کہ گزارے جیسا

-----

وہ کھڑکیاں مدت سے یوں ہی دیکھ رہا ہوں  
پردے سرکتے تھے، سرکتے ہیں ابھی تک

-----

آن فضاؤں میں سکھایا گیا اُڑنا ہم کو  
آندھیاں جال اٹھائے ہوئے پھرتی ہیں جہاں

-----

تم نے کتنی دیر لگا دی پاس ہمارے آنے میں  
ہم تبدیل ہوئے بستی میں اور بستی ویرانے میں

-----

پھر ملیں گے ذرا سا دم لے کر  
کچھ مسافت ہے درمیاں بابا

-----

آخری شعر تو باطنی کش مکش اور پھر اس سے ایک نمودار صداقت، یعنی حیات بعد الموت کی حقیقت کو  
نہایت خوب صورت پیرائے میں ظاہر کرتا ہے۔ اس نوعیت کے مضامین عموماً صاحب تجربہ اور  
تجزیاتی مطالعے کے حامل شعرا کے ہاں ان کی باطنی کش مکش کی گواہی کے طور پر آئے ہیں۔ فہیم  
شناس کاظمی کی شاعری میں ایک اور ندرت جس نے مجھے بار بار چونکا دیا وہ ہے ان کے ہاں  
جدبات افروز یادوں کی کار فرمائی۔ یہ جذبات افروز یادیں جہاں فہیم شناس کے تخلیقی نظام میں

ایک محرک کا کردار ادا کرتی ہیں وہاں تازگی اور معنی آفرینی کو فروغ بھی دیتی ہیں۔ فہیم شناس نے انسانی قدروں کی پامالی اور شہری زندگی میں دم توڑتی ہوئی جمالیات کو بھی اسی شدت سے محسوس کیا ہے جس شدت سے وہ اپنے داخلی احوال کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں خارجی احوال کے حوالے سے بھی ایک ایسی دردناکی موجود ہے جس کا ادراک و احاطہ وہی شاعر کر سکتا ہے جو لطیف و نازک احساسات کا حامل ہو۔ ان کے ہاں خیالات کا تنوع اس بات کی بھی گواہی دیتا ہے کہ وہ غور و فکر کے بحر عین میں غوط زن ہو کر اپنے گوہ مقصود تک پہنچنے کی ممکنہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ فہیم شناس کے کچھ اور شعر دیکھیے جو ذاتی اور سماجی المیوں کی کوکھ سے جنم لینے والی اشارتی معنویت کی اعلیٰ مثال ہیں۔

اک تمنا کے سادہ خاکے میں  
رنگ بھرتے خزاں کو دیکھتا ہوں

-----

کچھ دنوں پہلے یہاں اک شہر سا آباد تھا  
اب نظر آتے نہیں اُس شہر کے آثار تک

-----

انھی آنکھوں میں سلگتا ہوا صحراء ہے جہاں  
اتنا پانی تھا کہ اک شہر یہاں ڈوب گیا

-----

مرا بھی گھر تھا گلِ عافیت سے مہکا ہوا  
اسی نگر اسی شہر بلا کے پیچ کہیں

-----

کیا بتاؤں میں حال دنیا کا  
راستے میں ہیں صبح و شام ابھی

-----

رنگ سے رنگ چرانا کوئی آس ا تو نہیں  
زندگی مجھ سے چڑائے لیے جاتی ہے مجھے

-----

کر آئے تیرے بھر کا ہر مرحلہ عبور  
آنکھوں میں دھول، پاؤں میں رستہ لیے ہوئے

-----

جانے کیسی ہے کشش بہتے ہوئی پانی میں  
ساتھ آنکھیں بھی چلی جاتی ہیں حیرانی میں

-----

بس ایک بار دیکھا تجھے اور اس کے بعد  
ہر شے ترے جمال میں تبدیل ہو گئی

-----

آج تک میں اسی زمین پہ ہوں  
وہ دھنک کی مثال ہے تا حال

فہیم شناس کے شعری مجموعے میں درج بالا اشعار کے علاوہ ایسے بھی بہت سے اشعار موجود ہیں جو اس بات پر گواہ ہیں کہ ان کے تخلیقی نظام میں غم جاناں کے ساتھ ساتھ عصری زندگی میں اقدار حیات کی پسپائی، جا گیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی ریشه دو ایسیں، افلام کے بڑھتے ہوئے عفریت، خود غرضی، ابن الوقی، تلاش معاش کے عذاب اور دیگر نفسی و معاشرتی برا ایسیں کے خلاف ایک شدید غصہ موجود ہے، یعنی ان کی شاعری میں زندگی کی کم و بیش تمام دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ کسی جدید شاعر کے لیے ضروری تصور کیا جاتا ہے کہ وہ معاشرتی اور کائناتی تغیرات کے حوالے سے نئی حیثت کا ثبوت دے جیسا کہ عزیز حامد مدنی نے لکھا ہے کہ شاعری کا موضوع ہمیشہ انسان اور اس کے خواب رہے ہیں، چنانچہ شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی محسوس کرنے کی قوت کو فروغ دے تاکہ اس کے لیے نئے مسائل اور نئی فضا کا احاطہ ممکن ہو سکے۔

فہیم شناس کاظمی کے ہاں سماجی آگھی کے ضمن میں وہ غصہ اور برہمی بھی موجود ہے جو ایک مہذب اور حساس آدمی کو برانگیختہ کرتی ہے اور وہ شور مچانے کے سے انداز میں گفتگو شروع کرتا ہے۔ فہیم شناس کاظمی کا کمال یہ ہے کہ وہ اس صورت حال میں بھی اظہار کے معیار پر کسی قسم کی مصالحت نہیں کرتے۔ وہ اپنے کلام موزوں کو شاعری میں ڈھالنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، اور یہی کوشش ان کے ایک قابل ذکر شاعر ہونے کی سب سے مضبوط دلیل ہے۔

میں فہیم شناس کاظمی کو ان کے دوسرے مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور تو قع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے تحقیقی وجود کا سنجیدگی کے ساتھ اعلان کرتے رہیں گے۔

خواجہ رضی حیدر

۲۹ فروری ۲۰۰۸ء

## زندگی نامہ

نام:	سید فہیم اقبال
قلمی نام:	فہیم شناس کاظمی
والد:	سید ناظم حسین شاہ کاظمی
تاریخ پیدائش:	۱۱، مئی ۱۹۶۵ء، نواب شاہ (سنده)
تعلیم:	ایم۔ اے (اردو)
ادب سے تعلق:	۱۹۸۲ء سے
صحافت:	ادبی کالم
سماجی اور ادبی خدمات:	۱) ممبر آرٹس کانسل آف پاکستان، کراچی ۲) بانی و جزل سیکرٹری ار باب قلم، نواب شاہ
سابق سینئر نائب صدر ایوان صحافت نواب شاہ ۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۱ء	
سابق جوانسٹ سیکرٹری سندھی ادبی سگنت، نواب شاہ	
تصانیف:	۱] سارا جہاں آئینہ ہے (شاعری) ۱۹۹۹ء ۲] سنده کی آواز (جی ایم سید کے عدالتی بیان کا ترجمہ)، ۲۰۰۲ء ۳] تیرے عشق نے مالا مال کیا، (صابر ظفر کی غزلوں اور گیتوں کا انتخاب، ۲۰۰۳ء)
زیر اشاعت:	(۱) راہداری میں گنجتی نظم (نظمیہ مجموعہ) (۲) محبت کی آخری نظم (نشری نظم)

(۳) فراق گور کچوری کے تنقید مضامین (مرتب)

### متفرق اشعار

إتنا غبار واقعی اڑتا ہے شہر میں  
یا ہم کو ہی شناس یہ دھندا دکھائی دے

تم اور ہم تو آتی جاتی لہریں ہیں  
عشق ندی تو یار ابد تک بہنی ہے

کوئی خود کو شناس کیا سمجھئے  
خود شناسی خدا شناسی ہے

جب خدا ہے تو پھر ہے ناممکن  
حادثے کا کوئی گواہ نہ ہو

خود کہاں کوئی بات کرتا ہے  
اختیارات بولتے ہیں میاں

کیسے سنبھال رکھی ہے تو نے یہ کائنات

ہم سے تو ایک دل بھی سنبھالا نہ جاسکا

شاس برسوں میں تم پہ کھلے گی وہ لڑکی  
شاس دیکھے نہیں جاتے خواب لمحوں میں

زندگی ایک جیسی لگتی ہے  
گھر میں، رستے میں اور دفتر میں

ہم ہی رُکتے نہیں فہیم شاس  
ورنہ یہ دل کہاں نہیں رُکتا

ہم نے کتنے ہی چاند چھوڑ دیے  
دل کے بس ایک داغ کی خاطر

پہلے تھی اختیار میں دنیا  
اور اب دل پہ اختیار نہیں

دل کے دورے سے ایک ہی پل میں  
مرگ سرمایہ دار ہوتی ہے  
اور غربت گزیدہ لوگوں کی  
موت بھی قط وار ہوتی ہے

-----

نگاہِ ہوس تجھ پر کی ہی نہیں  
ہوئے ہی نہیں آج تک پاک ہم  
ترا سامنا پھر نہیں کر سکے  
ہوئے عشق میں اتنے بے باک ہم



رات کے دشت میں ستارا ملا  
تو ملا تو مجھے کنارا ملا  
صرف میں ہی گناہگار نہیں  
اس سے دل کو بڑا سہارا ملا



دین و دنیا سے گزارے ہوئے لوگ  
اب کہاں جائیں یہ ہارے ہوئے لوگ

